جملہ حقوق محفوظ سلسلہ مطبوعات عصمت نمبر

قلب حزیں

تصنیف

مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری مدظلہ

جسے

رازق الخیری ایڈیٹر عصمت و بنات نے

عصمت بک ایجنسی دہلی سے شائع کیا

جون ۱۹۳۱

قیمت آٹھ آنے

تیسری مرتبہ

قلبِ حزین

یعنی

مصوّرِ غم حضرت علّامہ راشد الخیری مدظلّہ

کے

چند ادبی مضامین

رازق الخیری اڈیٹر عصمت نے مرتب کرکے

دفتر عصمت دہلی سے شائع کیا

فہرست

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
تو	۳	شوہر کی قبر پہ	۳۳
محبت کا تاج	۵	میری آرزو	۳۵
داستانِ ستم	۷	جذبۂ نسوانیت	۳۷
اے نیند کی متوالی	۱۲	بانسری کا نغمہ	۴۰
کیا بیگموں کے یہی کام ہیں	۱۳	کل کیا ہوگا	۴۱
بہارِ شب کا خاتمہ	۱۷	بیوہ جوگن	۴۳
اُجڑی زندگی	۱۹	یاسمین کا پردہ	۴۶
دمِ واپسیں	۲۱	مایوسی	۴۸
دُنیا کی بڑی جنت	۲۶	فلسفۂ موت	۴۹
عالمِ خیال	۲۷	بعد الموت	۵۰
بچھڑے ہوؤں کی یاد	۲۹		
جہاں میرا شوہر ابدی نیند سوتا تھا	۳۱	مشرقی بیوی	۵۴

تُو

جب دودھ کے قطرے، ایک انسانی ہستی کے جسم سے نکل کر، میری کشتِ حیات کو سیراب کر رہے تھے —— جب ایک آغوشِ نسوانی کا، جذبۂ محبت، میری نشو و نما میں مصروف تھا —— تو میں نے آسمان کی وہ قندیل دیکھی جو کائنات کو کچھ دیر جگمگا کر گل ہو گئی —— میں نے زمین کا وہ پھول دیکھا، جو ہوا کو رات بھر مہکا کر مرجھا گیا...

مگر تو اُس وقت کہاں تھا؟

وقت آ گیا —— کہ وہ ہونٹ —— جن پر میری صورت دیکھ کر، مسکراہٹ کھلتی تھی، خاموش ہوں، اور وہ آنکھیں —— جن کی پنکھڑیاں ہر لمحہ قربان ہوتی تھیں، اپنا منہ پھیریں —— یہ وہ ساعت تھی، کہ نشۂ محبت کے مخمور، ہاتھوں نے مجھے زمین کی آغوش میں اُتارا۔

میں نے یہاں اس درخشندہ آفتاب کو دیکھا —— جس کو شام کے وقت چڑیوں نے اپنے نالوں سے وداع کیا —— میں نے یہاں اس بلبل کو دیکھا جس کا زمزمہ ایک عالم کو مسخر کرتا ہوا ہوا میں فنا ہو گیا........

بتا، تو اس وقت کہاں تھا؟

منزلِ حیات کا تیسرا دَور —— عہدِ شباب تھا، زمین کی آنکھیں
میرے قدموں پر، موتی لٹا رہی تھیں۔ اور کائنات کی ہر آغوش میری طرف
پھیلی ہوئی تھی۔ . . . . تب، میں نے، وہ نازک، اور روشن
صورتیں دیکھیں جو اپنی بہارِ حُسن دکھا کر جھریوں سے ہمکنار ہوئیں ——
میں نے یہاں بجلی کی وہ چمک دیکھی، جو ایک لمحہ کے واسطے دُنیا کو
مُنور کر کے کرۂ آسمانی میں ختم ہو گئی .. ..

تو جب بھی مجھے نظر نہ آیا؟

مگر، آج —— جب، آسمان کا روشن ذخیرہ —— اور زمین
کی بیش بہا کائنات، میری آنکھوں سے اوجھل ہے —— بہت
سی پیاری صورتیں، ہمیشہ ہمیشہ کو بچھڑ گئیں —— اور وہ اعضا
جن پر گھمنڈ تھا، دغا دے گئے —— تو میں نے اپنی وہ اندھی
آنکھیں دیکھیں، جو کبھی روشن تھیں —— میں نے اس وقت
اپنے وہ مضلوج ہاتھ دیکھے۔ جن کی طاقت فانی تھی.. .. ..

تو اس وقت سب مجھے نظر آیا !!

مگر! کیا یہ صحیح ہے! کہ موت مجھ کو تجھ میں جذب کر دے گی؟

"عصمت" دسمبر ۲۳ء

محبت کا تاج

وہ تمام اُمنگیں ـــــــــ جن کا خوشنا چہرہ ـــــــــ سنہری اُمیدوں کی خاموش لہروں سے آراستہ تھا، اس مٹی کے ڈھیر میں دفن ہیں"

جسد خاکی فنا ہو چکا، مگر ـــــــــ محبت ـــــــــ روح کے تاجِ شاہی کو ـــــــــ جگمگا رہی ہے۔

لازوال مسرتوں کے خزانے، اس قبر میں موجود ہیں اور کائنات کا ہر ذرہ اِس ازلی سلطنت کے زیرِ نگین ہے!!

آنکھ ـــــــــ حُسن کے اِس مجسمہ سے ـــــــــ دُور ہو گئی۔

مگر، دِل ـــــــــ ان قدموں پر ـــــــــ قربان ہو رہا ہے۔

فاختہ کی کُوکُو، ہوا میں جذب ہو ـــــــــ آفتاب و ماہتاب کا سایہ، لوریاں دے دے کر فنا ہو،

مگر محبت کے نُورانی فرشتے، سدا بہار پھول چڑھا رہے ہیں۔

اِنسانی دُنیا کا ہر لمحہ ـــــ زندگی اور اس کی تمام
کائنات ـــــ فانی ـــــ مگر

محبت کی دیوی ـــــ ازلی و ابدی زیورسے،
آراستہ ـــــ فضاءِ حیات میں تیر رہی ہے ـــــ وہ
ایک نور ہے، خاموش ـــــ ایک دولت ہے، لازوال
ـــــ اور ایک حسن ہے، دائمی۔

محبت حور ہے، فرشتہ ہے، خدا ہے،
موت تیری ہیئت تبدیل کر چکی ـــــ ہوا کے تیز جھونکے
اس زمین کو تہ و بالا کر دیں ـــــ مگر
دُنیا تیری پرستش کرے گی ـــــ اس لئے کہ
محبت کا تاج تیرے سر پر ہے،

عصمت مارچ ۲۶ء

داستانِ ستم

جہاں پھول کھل کھل کر سرسبز شاخوں ہی میں مرجھا جاتے تھے
—— جب دریا کی لہریں آپس ہی میں لپٹ لپٹا کر فنا ہو جاتی تھیں
اور آفتاب کا روشن چہرہ زرد پڑ جاتا تھا ——— ٹھیک
اسی وقت جب سیاہ چمکدار پروں والی بُلبل سرو کی سب
سے اونچی ایک تنہا ٹہنی پر بیٹھکر اپنا نالہ شروع کرتی تھی اور
بساطِ فلک کی ننھی مخلوق، چھوٹے چھوٹے تارے اپنے نوشہ
کے استقبال کو صف آرا ہو جاتے تھے ——— ایک مغموم جھونپڑی
سے جس کی شکستگی صنوبر کی بیلیں چھپائے ہوئے تھیں اور املی
کے گھندار پتے سایہ کیئے ہوئے تھے ——— ایک خاموش
لڑکی باہر نکلتی ——— کنار دریا پر بیٹھتی ——— اور کچھ
سوچتی +

اس کے ٹھنڈے سانس ہوا میں تیرتے اور دو نازک ہونٹوں
کی یہ سریلی صدا چمن میں گونجتی:-
" آہ کوئی نہیں "

جب رات کا دسترخوان چادرِ فلک سے اُٹھ جاتا ——— مشہور ستارے چاند کی وداع پر سینہ کوبی شروع کر دیتے ——— آفتاب کی تمازت پردۂ دُنیا سے ناپید ہو جاتی ——— منہ بند کلیاں صبا کی گدگدیوں سے جھک جھک کر مسکراتیں ——— جہاں خوش رنگ پھول پتیوں کی گود میں جھولا جھول کر ہوا کو معطر کرتے ——— بالکل اسی لمحہ میں جب کوئل کی کوک گلشن کی آبادی کا کلیجہ توڑ دیتی اور ہوا کے جھونکے صبح کا پیام لاتے ——— وہی اِنسانی ہستی اُٹھ کھڑی ہوتی ——— خاموش نظریں چاروں طرف جاتیں ——— مایوس قدم آگے بڑھتے ——— اور نازک ہاتھ ایک گلاب کے پھول کو چھوتے ہوئے رُک جاتے اب ہونٹوں کی بجائے ایک مُنہ بند لمبا سانس ایک بیل کے کان میں اِتنا کہتا:-

"ہاں! اَب بھی نہیں"

جب بزمِ انجم کے تمام مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو جاتے اور شمعِ فلک کی روشنی پھیکی پڑ جاتی ——— آسمانی کائنات کا ہر ذرہ وہم ہو جاتا، وہ رونق اور چہل پہل سب ختم ہو جاتی، اِس روشن مجلس پہ اوداسی کی نقاب پڑ جاتی اور ایک سناٹے کا عالم طاری ہو کر پَو پھٹنے لگتی ——— جہاں باغبان کی مشقت کلیوں کو پھول بناتی اور خوش رنگ پتیاں کرہ ہوا میں تیرتیں ———

معاً اس دم جب تیتریوں کے رنگین پر اپنی خاموشی توڑ دیتے اور چمکیلے بھونروں کی بھنبھناہٹ پھولوں کے حسن کا کلمہ پڑھتی اور بزمِ گل اپنے مداحوں کی نغمہ سرائی سے پٹ جاتی ــــــ وہی انسانی آنکھیں دل کے کان میں کچھ کہتیں اور اب خاموش رخساروں پر صرف دو قطرے موتی کی طرح چمکتے ہوئے دکھائی دیتے اور فنا ہونے سے پہلے بہہ جاتے۔

"یوں ہی سہی"

چکور کا اضطراب بے سود، بلبل کا نالہ بیکار ، قمری کی کوکو غلط ، چاند اس کے سامنے ، پھول اس کے پاس، سرو اس کے ساتھ ــــــ مگر

کیا ہے

آہ کس سے کہوں ؟ کیا کہوں ؟ میرے جنگل کے رفیق ــــــ میرے صحرائی مونس ــــــ میرے چمنستانی پھول ــــــ دریائی لہریں۔ اور آبشار کی بیلیں میرے دل کا آئینہ ہیں۔ میری بیگناہی کی شاہد مگر... ...

کون پوچھے ؟ اور، کیوں پوچھے ؟

سعید نہیں آیا ــــــ میں ختم ہوگئی اس کے تین دن ختم نہ ہوئے ــــــ آہ تین دن نہیں تین مہینے ــــــ راتیں آنکھوں میں کٹیں اور دن انتظار میں بیتے ــــــ

کہاں دیکھوں کیونکر دیکھوں ، کدھر دیکھوں ، کس طرح دیکھوں

شوہر ہے، مالک ہے ــــ متمول ہے، حسین ہے، معزز ہے۔
مگر آہ، میں نے کہدیا تھا، کہلوا دیا تھا، سُنا دیا تھا، سُنوا دیا تھا ــــ غریب ہوں، بدصورت ہوں، فقیر ہوں ــــ مجھے اقرار ہے کہ موجودہ دنیا میں میری نامعقول صورت کو ــــ میرے سیاہ رنگ کو ــــ میرے ماباپ کے افلاس کو ــــ ان کی عزت کو ان کی حیثیت کو ــــ حق نہ تھا یقیناً نہ تھا کہ بزم حسیناں میں، دولت والی دنیا میں، عزت والی مجلس میں، مالداروں والی محفل میں، جگہ پائے، شریک ہوا داخل ہو،
مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے، میں سعید کے قابل نہ تھی، مگر میں بے قصور ہوں غلطی اماجان سے ہوئی، نتیجہ میں نے بھگتا، مگر میں نے تو بتا دیا تھا، جتا دیا تھا "کہ ہم کچھ نہیں"
دولت نہیں، عزت نہیں، صورت نہیں،
اس نے مجھے دیکھا میری حیثیت دیکھی، میری حالت دیکھی پھر؟
"کچھ نہیں کہتی"

اس کے تیور، پہلے ہی ہفتہ میں ــــ آہ، پہلا کیسا؟ وہی اول، وہی آخر ــــ کہہ رہے تھے کہ اس کی آنکھیں کچھ اور ڈھونڈھ رہی ہیں، سعید کو وہ ساعت، وہ لمحہ، وہ منظر یاد نہ رہا جب وہ رخصت ہو رہا تھا اور میں منت سے کہہ رہی تھی،
"تین بہت ہوتے ہیں"؟

غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے ـــــ جب، کائنات، روزِ روشن کی وداع کا نقارہ بجاتی ہے ـــــ جس وقت، پرند خاموش ہو جاتے ہیں اور آسمان جنازۂ آفتاب کے واسطے خونیں کفن تیار کرتا ہے ـــــ جہاں بارآور شاخوں کے پھل پھول گر گر کر فنا کا سبق سناتے ہیں ـــــ اسی زمین پر خاک کا ایک ڈھیر قبر کی ہیئیت میں دو منتظر آنکھوں کی پردہ پوشی کرتا ہے ـــــ سرسبز پتے، خشک پتیاں، ہوا کے ساز میں، اس مظلوم لڑکی کا مرثیہ پڑھتے ہیں، اور ڈوبتا ہوا آفتاب ایک بے وفا شوہر کے مظالم کی داستان، دنیا کو سناتا ہوا ختم ہو جاتا ہے۔

"بے گناہ، مگر، ناعاقبت اندیش، باپ کے آنسو، خاک کے ڈھیر پر دن رات گرے، مگر آہ! محبت کے دو پھول ـــــ جو سعید کے خود غرض ہاتھ اس قبر پر چڑھا دیتے ـــــ کبھی نہ دیکھے گئے۔"

صبح صادق کے وقت، جب بلبل شاخ گل پر بیٹھی قربان ہو رہی تھی دفعتہً خاموش ہوئی، لڑکی کی قبر کو بوسہ دیا اور یہ کہہ کر اڑ گئی۔

عصمت زبیر ۱۹۳۸ء

اے نیند کی متوالی!

اے نیند کی متوالی! آنکھیں کھول —— ہوشیار ہو، اُٹھ اور اوپر دیکھ —— نیلگوں آسمان نے رنگ بدلا، اُودی اُودی گھٹائیں جھوم جھوم کر اُٹھیں، کالے سیاہ بادل چاروں طرف سے آگھرے۔ اور صاف شفاف آسمان آناً فاناً کالا بھنور ہو گیا۔

کیوں نیند کی متوالی! کچھ دیکھا! کھڑی ہو، آسمان کو دیکھ اس تغیر کو پڑھ، دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا، جلد بہت جلد، تیری زندگی کے آسمان پر بھی یہ انقلاب ہو گا —— مگر دعا ہے کہ وہ خوشی کے بادل ہوں اور فرحت و انبساط کی جھڑیاں تیرے دل کو سیراب کریں،

نومبر ۲۲ء

کیا بیگموں کے یہی کام ہیں

جب آفتاب کا چہرہ قوت کی وحشت سے زرد پڑ جاتا ——— پردہ دُنیا پر ایک قسم کا سناٹا چھانا شروع ہوتا ——— دھوپ پھیکی ہو جاتی ——— درختوں کی سرسراہٹ میں تیزی اور ہَوا کے جھونکوں میں خنکی پیدا ہو جاتی ——— روز روشن وداع کی اور پرند بسیرے کی تیاریاں کرتے ——— اس وقت ایک پھٹے پُرانے کپڑوں والی عورت ——— ایک میلی کچیلی دری پر ——— ایک ننگ دھڑنگ کالے کلوٹے بچہ کو، چمکارتی ——— بچہ ٹھنکتا، کلبلاتا، بسورتا، اور روتا،

"چپکا کر، خاموش کر، منع کر"

یہ منتفقہ آوازیں اُس کی حسرتوں کا خون کر دیتیں ——— مگر وہ برداشت کرتی ——— ہنستی اور تعمیل کرتی ——— کیوں؟ اس لئے کہ وہ کمزور ہے ——— تھوڑی دیر کی خوشی کے بعد اس کی مامتا پھر جوش کرتی، وہ آہستہ سے اور بہت خاموشی سے اس کا منہ دودھ سے چھڑا دیتی اور اِدھر اُدھر دیکھ کر کہ پھر کوئی خفا

نہ ہو، کسی کو تکلیف نہ ہو، اس جذبہ سے مجبور ہو کر جس کی لہریں دل میں جوش مار رہی ہیں، اس کو دیکھتی اور گردن کا ایک خاموش اشارہ کر کے منہ ہٹا لیتی، بچہ مسکرا دیتا وہ ہنس دیتی اور پھر دودھ منہ میں دیدیتی،

یہ کیوں ہے؟ اس واسطے کہ طاقتور حق رکھتا ہے کہ کمزور پر حکومت کرے، اُس کو اختیار ہے کہ اپنے عیش میں، اپنی خواہش میں اپنی ضرورت میں کوئی ہرج واقع نہ ہونے دے،

ایک مہین آواز سے وہی کالا کلوٹا بچہ

"کیا کر رہی ہے سنتی نہیں جا جا دور لیجا"

چاندی کے چند سکوں کے بدلے یہ غریب عورت کیا کچھ فروخت کر چکی ——— ہاتھ پاؤں ——— نہیں نہیں۔ آزادی *

اس کا فرض ہے کہ ان مالکوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دے اور اس کوشش میں اپنی راحت، اپنا سکھ، اپنی تندرستی اپنی بھوک حد یہ ہے کہ اپنی ماتنا تک قربان کر دے۔

"کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ باتیں ہو رہی ہیں اس کو سلاتے سنتی نہیں؟"

"اچھا بیگم ابھی سلاتی ہوں"

ایک نیلے رنگ کی کثیف چادر کی گرہ کھول کر —— اُس وقت جب نیم کی سبز پتیاں سر پر جھوم رہی تھیں —— اُس وقت جب اِس نیم کے سب سے اوپر کی شاخ میں فاختہ اپنے انڈوں کو سینہ سے لگائے اطمینان سے بیٹھی تھی

عورت نے افیم کی پُڑیا نکالی ،

بچّہ پھر رویا ....

"ہائے کیا بے غیرت عورت ہے مردوں کا بھی تو لحاظ نہیں! سُلا دے اِسکو"

"ہاں ہاں بیگم صاحب ابھی"

ہنستے ہوئے بچہ کو، اس لئے کہ سو جائے، تھوڑی سی افیم دی اور کندھے سے چمٹا کر اس وقت تک تھپکتی رہی جب تک بچّہ کی ہنسی خاموش، اور کلکاریاں ختم نہ ہوگئیں۔

کیا وہ بچہ اِسی کا مستحق تھا کہ اِنسانی دُنیا محض اپنے آرام کی خاطر اُس کی معصوم اُمنگوں کا خاتمہ کر دے ؟ کیا اُس عورت کو بھی جس نے افیم دی —— بچہ کے ہمکنے سے ایسی ہی تکلیف ہو رہی تھی ؟

نہیں نہیں اس بچہ کی مکروہ صورت مختلف آنکھوں میں مختلف شکلیں اختیار کر رہی تھی —— وہ بیگم کو مکروہ تھا، مگر عورت کو محبوب —— اس کی آواز اُدھر ناگوار تھی۔ اِدھر خوشگوار

لیکن معاملہ تھا طاقتور اور کمزور کا ـــــ بیگم اور ماما کا ـــــ دولتمند اور مُفلس کا

رات کو جب بیگم کی میز پر زرق برق لباسوں میں چاروں طرف کرسیوں پر سہیلیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ پیانو بج رہا تھا اور بیگم حالت وجد میں گردن ہلا رہی تھی، کیا کوئی کہہ سکتا تھا کہ بچہ کے رونے کی موسیقی اُس موسیقی سے جو سب کو محظوظ کر رہی ہے عورت کے واسطے بہت زیادہ پُرلطف تھی۔

بچہ سو گیا۔ عورت نے ایک پھٹی سی دری پر لٹا دیا بیگم کو اطمینان ہوا، مگر ایک معصوم روح کو دولت کے زعم میں فنا کر دینے والی عورت، کیا واقعی بیگم کہے جانے کی مستحق ہے۔

بہارِ شب کا خاتمہ

گرمی کے دنوں میں —— جب کائنات نے رات کا خاموش لباس پہن لیا —— تو پہاڑ کی بلند چوٹی سے چاند نے جھانکنا شروع کیا، چاندی کے ورق ہر طرف بچھے ہوئے تھے، ہوا اِدھر اُدھر اُچھلتی پھرتی تھی —— مگر بلبل کی خاموشی اور وداعِ آفتاب نے فضاء عالم میں ایک سناٹا پیدا کر دیا تھا —— آبشار کی سنہری بانسری جو چمن سے دور بج رہی تھی۔ کبھی کبھی اپنی میٹھی تانوں سے درختوں کو چونکا دیتی تھی۔ اور پھر دُنیا سنسان ہو جاتی تھی رات قدرت کے چمکدار آبِ رواں میں غسل کر رہی تھی —— یاسمین وگلاب پھریریاں لے لے کر پانی کے قطرے —— موتیوں کی صورت میں کائنات دہر پر نثار کر رہے تھے —— میں قریب کے چمن میں اس مقام پر پہونچی جہاں پھول سوتے تھے۔ ہوا گن گنا کر لوریاں دے رہی تھی، اور یہ گلہائے رنگیں جو تھی کی دلہن کے مانند جدائی کی نیند میں سرشار آغوشِ شب میں سب بے خبر پڑے سوتے تھے،

جب بزم انجم کا نوشہ مضمحل ہوا۔ اور رسیلی آنکھوں میں

نیند کے ڈورے نمودار ہوئے۔ تو آفتاب اس کے استقبال کو آگے بڑھا اور خدام فلک نے ہاتھوں ہاتھ خوابگاہ تک پہونچا دیا۔

صبا بے خبر پھولوں کو گدگدانے لگی ـــــ نالۂ بلبل نے اُن کو چونکایا ـــــ شبنم نے ان کے ہاتھ منہ دھلائے۔

صبح صادق کی نورانی ساعت تھی ـــــ آسمان کے دسترخوان پر ابھی طعام شب کے بچے کھچے ٹکڑے موجود تھے۔ مگر کافوری شمعیں رات بھر ساتھ دیکر پھیکی پڑ چکی تھیں ـــــ کہ موذن نے بکلّی نے، ناختہ نے، وہ سماں درہم برہم کر دیا۔

میں پھولوں کی نیند کا مطالعہ کر رہی تھی اور دیکھتی تھی کہ ان بچوں کی طرح جو آغوشِ مادر میں لپٹے پڑے ہوں بے ہوش پڑے تھے، صبح اُن کو جگا رہی تھی اور وہ کروٹیں بدل بدل کر بدستور سو جاتے تھے۔

میں نے مصمم قصد کیا کہ پھولوں کی نیند پر اپنی نیند قربان کروں گی۔

ابھی آفتاب کی شعاعیں پوری طرح نمودار نہ ہوئی تھیں کہ آہ بہارِ شب کا خاتمہ ہوا ـــــ صیاد کا پنجۂ آگے بڑھا اور ان پھولوں کو یہ کہہ کر فنا کر دیا

"بس یہ بہار اتنی ہی تھی"

نومبر ۲۲ء

ابدی زندگی

ایک ایسے خاموش اور سنسان میدان میں جس کے نشیب و فراز کا ہر ذرہ اور موسمِ خزاں سے قبل سوکھی ہوئی گھاس کا ہر پتہ اپنی بہار ختم کر چکا تھا۔

۲۰ مارچ کے آفتاب نے فلک نیلگوں کی سیاہ مسہری میں جانے کی تیاریاں کیں رات کا اندھیرا سیاہ بادلوں کی طرح میدان کے گوشہ گوشہ پر قبضہ کر رہا تھا، کہ چاند کے مستقل داخلہ نے یہ عارضی انتظام درہم برہم کیا، قبروں کے مختلف کتبے اجسام فانی کی وداعِ ابدی پر حسرت کے آنسو گرا رہے تھے۔ رات اس وقت خاموش تھی درختوں کی ٹہنیاں خشک ہو چکی تھیں اور باوجود اس کے کہ میدان بڑے بڑے بہادروں، بے مثل ادیبوں، یکتا حسینوں اور خوبصورت بچوں کو گود میں لیے تھا، دُور تک خاموشی تھی۔

یہ کیسے تعجب کا مقام تھا، جہاں بڑے بڑے دعوے خاک میں مل رہے تھے، چھوٹا ولیم اپنی قبر پر بیٹھا ماں کی طرف ہمک رہا تھا ـــــــ خوبصورت ایلینا جس کی نظروں کے تیر دلوں کے پار ہوتے تھے شوہر کو بھینچ بھینچ کر

دم واپسیں

اپریل کی ایک اس شام کو، جب، انیسویں صدی کی مخلوق، کشاکش ہستی میں منہمک تھی، آسمان، زمین والوں کی کج فہمی پر ہنس رہا تھا ـــــ ایک ایسی شام کو جب، ہوا، کسی چمن کے، خاموش گوشہ میں، کلیوں کا منہ کھول رہی تھی ـــــ ایک ننھی سی روح، اضطراب آمیز، استقلال، نفرت آمیز انفعال، سے کوشش کر رہی تھی کہ، آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں میں، جا ملے رخصت ہو جائے پیوست ہو جائے۔

ایک ننھا سا بچہ ایک ماں کی گود میں تھا، اور ایک آنکھ جس میں آنسوؤں کا قطرہ تک نہیں، مگر ممتا کا دریا لہریں لے رہا تھا، حسرت و یاس سے بھری، ایک معصوم چہرہ پر، ایک ایسی صورت پر، جس نے دو سال خونِ جگر پیا، جو چھ سال سینہ پر لوٹی، پڑ رہی تھی ـــــ موت کا فرشتہ، ایک نورانی نقاب لئے ان دو زندہ روحوں کے پاس کھڑا تھا، اور منتظر تھا اس وقت کا جب ایک آخری سسکی، اس پھول کو مرجھا دے، اور قدرت کا ایک آبدار

نشتر اس قابل رحم عورت کی تمام اُمیدوں کا خاتمہ، ارمانوں کا تکملہ، اور خواہشوں کا انجام دکھا دے،

کمرہ کے در و دیوار، اس ننھے سے مہمان کو حسرت سے تک رہے تھے، اور چار برس کا رفیق کتا، اپنے پیارے مالک کے سرہانے خاموش بیٹھا تھا،

صحن کی زمین آج سے ہفتہ بھر پہلے اسی وقت، الوداع کہہ چکی تھی، جب ننھے پاؤں، آخری مرتبہ، اس کی گود میں پہونچے مگر کمرے کے در و دیوار اس سکون مطلق میں، جو اس وقت چاروں طرف طاری تھا۔ اپنے ہمدم کی مفارقت ابدی پر، آنسوؤں کے پھول چڑھا رہے تھے۔

عورت ـــــ جس کے پہلو میں ایک زخمی دل چٹکیاں لے رہا تھا، جو اسی قسم کے ایک داغ سے پہلے ہی آشنا ہو چکی تھی ـــــ گھور رہی تھی۔ اُن آنکھوں کو جن سے محبت کی شعاعیں نکلتی تھیں، تک رہی تھیں، ان ہونٹوں کو، جن سے پھول جھڑتے تھے، اور دیکھ رہی تھی، ان ہاتھوں کو جو گلے میں پڑ کر، عالم حیات کی تمام تکالیف کو زایل کر دیتے تھے اور دل ایک ایسی خوشی محسوس کرتا تھا، جو، سب لوٹ چکی تھی اور جس کے آس پاس الام کی جھلک تک نہ تھی، اعضاء جسمانی اپنا کام کر رہے تھے، مگر قلب و دماغ، اس قوت کو جو رنج و راحت پہونچا سکے، بھول چکے تھے ـــــ عورت

ایک تصویر تھی ساکت ـــــ ایک اِنسان تھی خاموش ـــــ
ایک شکار تھی زخمی،

قریب، آپہونچا، آخر وہ وقت، جب وہی جسد خاکی جو طرح طرح کے اندازوں سے دِل موہتا تھا، ان ہی آنکھوں کے سامنے جو دیکھ دیکھکر نہال ہوتی تھیں، تڑپ تڑپ کر، روح سے جدا ہو ـــ وہ پھول جو ہر لمحہ دل و دماغ تازہ کرتا تھا، مرجھا جائے ـــــ وہ چاند، جس کی روشنی بہت سے دلوں کو روشن کرتی تھی گہنا جائے ـــ وہ بچہ جس کے قدموں پہ، ماباپ آنکھیں بچھاتے تھے۔ ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سو جائے۔

نبض ساقط ہوچکی تھی، مگر گلشن اُمید، لہلہا رہا تھا، محبت انتہائے محبت، اُلفت، الفت بدرجہ غایت، فریفتگی، عشق، نہیں مامتا نے، ہوش، حواس زائل کر دیئے تھے، ایک یقین تھا، ایک تسکین تھی، ایک خیال تھا، ایک اُمید تھی، کہ ایک زبردست قوت اس انقلاب میں، کام کر رہی ہے، اور اگر وہ رحم کرے، وہ شن نے، وہ سمجھ سکے، وہ محسوس کرسکے اور کرے تو یہ سبزۂ زندگی، یہ لازوال دولت کی ڈھیری تغیر سے محفوظ، بدستور کھیلتی ہنستی پھرتی، بولتی، چالتی کلیجہ سے لگی رہے۔

دِل بہت سے تھے۔ متمنی تھے، دُعا گو تھے، مگر ایک تھا ـــــ ایک عورت کا دل تھا ـــــ اسی کا، اسی عورت کا ـــــ جو اپنے یقین

کے موافق اس طاقت سے ــــ جو خدا کے نام سے تعبیر ہوتی تھی ــــ التجا کرتا تھا، روتا تھا، سر جھکاتا تھا ــــ کیسا دل تھا، سچا تھا، صاف تھا، مسلمان کا دل تھا،

بالآخر دمِ واپسیں نے، تمام تعلقات منقطع کر دیے، اُمیدیں اور دُعائیں، ختم ہو گئیں، ایک گوشت کا لوتھڑا، بیجان رہ گیا ــــ کچھ ہڈیاں تھیں، کچھ بال تھے، کچھ کھال تھی،

فضائے عالم میں، پھرنے والی پاک روحوں تم ہمسکو فراموش کر گئیں مگر، ہمارے دل، تمہاری یاد سے غافل نہیں، تمہارا عارضی قیام مدتوں خون رُلوائے گا تم ظاہری آنکھوں سے بچھڑ گئے، لیکن حافظہ، تم کو نہیں بھولتا،

کھلنے سے پہلے مرجھانے والی کلیوں! تمہاری خوشبو آجتک دماغ میں بسی ہوئی ہے، آنکھیں تمہاری خاک سر پر رکھ رہی ہیں، کہاں ہو کلیجہ کے ٹکڑوں، چاندسی صورت دکھا دو، برکت والے بندوں، دل کی راحت لے گئے، اور وہ داغ چھوڑا کہ دل و دماغ بیکار ہو گئے زندگی میں موت کا مزہ چکھا دینے والے پیاروں، کان تمہاری باتوں کو ترس گئے، چاروں طرف خاک چھان لی، مگر تمہارا پتہ نہیں چلتا، کیسی پُر لطف تھی تمہاری شبِ حیات، اب وہ رات میسّر نہیں ہوتی اور کس قدر ظالم تھی، وہ صبح جس نے بزمِ وصال درہم برہم کر دی۔ مبارک تھے تم کہ تمہاری خاک تک عزیز ہوئی اور آج تمہارے

فانی اجسام کا مسکن، ہمارا سجدہ گاہ ہے، تمہاری صورتیں آنکھ سے اوجھل ہو چکیں، مگر تمہارے ہاتھ کی جلائی ہوئی شمع روشن ہے اور اسکی لَو کلیجہ میں لگ رہی ہے،

آسمانی دولت کے، مالکوں! اسی فانی دُنیا سے جہاں رنگ برنگ کے پکھیرو اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں، بعض، جگر خراش صدائیں بھی آرہی ہیں اور ایک جم غفیر، خواہش نفسانی کی زنجیروں میں جکڑا باآواز بلند، تلقین کر رہا ہے کہ، ہم تمہارا خیال تک دِل سے بُھلا دیں، اور جلال، منور گھروں کو، اندھیرا گھپ کر گئے اُن کا دھیان تک نہ آئے۔ مگر انصاف کی آنکھیں، ان کا مضحکہ اُڑا رہی ہیں، اور دل، یہ صدا دے رہا ہے۔

کلیجہ کے ٹکڑوں، اگو تجربہ نے اُمید مواصلت منقطع کردی، تمہارا قیام چڑیا رین بسیرا تھا، تم ہم سے چھوٹ کر اچھی جگہ پہونچ گئے تمہاری بھولی بھالی صورتیں ہماری آنکھوں سے چھپ گئیں، اب تم کہاں اور ہم کہاں، دِل کی بستی سونی گئی اور اب اس کی آبادی، اللہ ہی اللہ ہے مگر، دِل تمہاری محبت کے دم بھر رہے ہیں اور مفارقت کے وہ پھول جو تم اپنے نازک ہاتھوں سے ہمارے کلیجوں پر رکھ گئے تادم حیات شاداب رہیں گے۔

عالم خیال کے شہزادوں، قریب آؤ تمہارے رخ نازک کو بوسہ دوں، دلِ مجروح کا یہ تحفہ قبول کرو اور یقین

کرو، کہ تمہاری یادگار یہ داغ فراق، مرتے دم تک تروتازہ رہے گا،

اپریل ۱۹۳۱ء

دُنیا کی بڑی جنّت

مَیں نے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر کائنات کا مطالعہ کیا ——
میری نظر آبادی میں پہنچی —— مَیں نے دُنیا کے گوناگوں رنگ دیکھے —— کہیں جنازے قبرستان جا رہے تھے —— کسی جگہ براتیں ہشاش بشاش نکل رہی تھیں —— مَیں نے عالیشان محل دیکھے —— رنج دیکھا —— اضطراب دیکھا —— یہاں تک کہ وہ پوشیدہ گھر دیکھا جہاں دو میاں بیوی اطمینان سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے،

"یہ دُنیا کی بڑی جنت تھی!!

۲۲ء

عالمِ خیال

رات کے اس حصہ میں، جب دماغ دن بھر کے افکار سے اُکتا کر سکون کی طرف راغب ہوتا ہے، قدرت اپنے ہاتھ سے لوریاں دیتی ہے، کبھی کبھی تخیل وہ صورتیں سامنے لا بٹھاتا ہے جنکو آنکھ سے چھپے مدتیں ہوگئیں تعلقات ہمیشہ کیواسطے بھلا چکے اور دُنیائے حیات نے جنکو بخیر و خوبی رخصت کر دیا، دل ان پر روتے روتے تھک چکے، نگاہ ان کو ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ہار گئی اور اب ان کا سراغ صرف اتنا چل رہا ہے کہ روح قفسِ عنصری سے اُڑ گئی اور جسدِ خاکی ایک مٹی کے ڈھیر میں دبا پڑا ہے جو ہو گیا یا اب خاک ہونے والا ہے،

رات کے اس حصہ میں جب نیند آنکھوں میں بھری ہوتی ہے، یہ بچھڑی ہوئی صورتیں جو وقت سے پہلے اُٹھ گئیں، یہ نازک پھول جو کھلنے سے پہلے مرجھا گئے، عالمِ خیال میں گلے سے لپٹتے ہیں، روتے ہیں، رُلاتے ہیں، ہنستے ہیں، ہنساتے ہیں، ترسی ہوئی نظریں محبت میں ڈوبی ان کے استقبال کو اُٹھتی ہیں اور آنکھوں میں لاکر بٹھا دیتی ہیں۔

اب انکی باتیں۔ ان کی زندہ راتیں ان کے سن، ہمارے بھرے دن جنکو عالمِ حیات۔ الوداع کر چکا۔ خیالستان کی نازک سرزمین میں سامنے آتے ہیں۔ اور کچھ دیر تک یہی اگلے پچھلے جلسے اپنا رنگ جما دیتے ہیں۔

رات کے اسی حصہ میں جب عمر بھر کی حسرتوں کا خون۔ اپنی تصویر دکھاتا ہے۔ اور وہ ہری بھری کوپلیں، جو لہلہاتے لہلہاتے مرجھاگئیں اُجڑی ہوئی نظر آتی ہیں، تو یہ خیال اِدھر اُدھر کی ٹھوکریں کھاتا دماغ کی ان حدود میں پہونچتا ہے جہاں یہ بچھڑے دوست جمع ہوتے ہیں، جلسہ شروع ہوجاتا ہے، مقدس عمامے، سیاہ چادریں، رنگین دوپٹے، بھولے بھالے چہرے، موجود ہوتے ہیں، چاند سر پر ہوتا ہے تارے جگمگاتے ہیں، دلِ مجروح اہل مجلس کے پاؤں چومتا اور ان کے قدم سر آنکھوں پر رکھتا ہے۔

رات کا وہی حصہ ہے۔ اور وہی محبت۔ اللہ اللہ کیسے کیسے لوگ جمع ہیں۔ دِل جن کے ملنے سے ناامید۔ اور آنکھیں جن کے دیکھنے سے مایوس ہو چکی تھیں۔ ہاتھ جن کو ناپید کر چکے تھے عالم خیال آج ان کو پیدا کر رہا ہے۔

آؤ آؤ۔ دِل پر حکومت کرنے والی تصویروں آؤ۔ آنکھیں تمہارے واسطے فرشِ راہ ہونگی۔ اور دِل تمکو پہلو میں جگہ دے گا۔ تمہاری مفارقت کا ہر حرف دیکھنے والوں کو سبق دے گا۔ ہم نے تمکو بھلا دیا۔ آنے والے ہم کو بھلائینگے تمہاری صحبت کوئی دم میں درہم برہم ہوتی ہے۔

رات کا وہی حصہ ہے مگر اب تخیل تمہارا ساتھ چھوڑے گا قدرتی لوریاں اپنا کام کرنے لگیں۔ نیند کا جادو چل گیا۔ اُٹھو۔ اُٹھو۔ تمہاری تصویریں دھندلی ہوگئیں۔ خدا حافظ۔

سنہ ۲۱

بچھڑے ہوؤں کی یاد

رات کے، اس سنسان وقت میں جب دُنیا بیخبر نیند کے مزے لیتی ہے۔ پرندا اپنے اپنے آشیانوں میں دبکے سکڑے پڑے ہوتے ہیں، چہل پہل والے گھر سنسان اور چخیم دھاڑ والے مکان گم سُم ہوجاتے ہیں، دل وحشی ان صورتوں کی یاد میں گھنٹوں تڑپتا ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے آنکھ سے ایسی اوجھل ہوئیں کہ اب ان کے نظر آنے کی کوئی اُمید نہیں۔

وہ ماں جس کی گود میں سچی محبت کے دریا لہریں لے رہے تھے، جس نے روٹھوں کو منایا، بگڑے کو بنایا، منت سے کھلایا، خوشامد سے پلایا! آج کہاں ہے۔ مٹی کا ایک ڈھیر اتنا پتہ دے رہا ہے کہ اولاد کی عاشق زار سچی غمگسار مرنے والی بیوی کی ہڈیاں اسی جگہ دفن ہیں۔

پھلواسے لال جو ہمک ہمک کر کلیجوں سے چمٹے، باتیں ملکا کر دل موہے، گلے سے لگ لگ کر آنکھیں ٹھنڈی کیں! اس وقت کدھر گئے؟ جو ہاتھ ان کو تھپک تھپک کر سلاتے تھے یہ گواہی دے رہے ہیں کہ وہ کلیجے کے ٹکڑے ان ہی ہاتھوں سے پیوند زمین ہوئے اور اس اندھیرے گھپ اور جنگل بیابان میں جہاں آدمی نہ آدم زاد تن تنہا پڑے آرام کر رہے ہیں۔

اے ناپائیدار دُنیا کیسے دوست جن کے خیال سے

کلیجہ منہ کو آتا ہے ہمیشہ کو جدا کر دے،

رات چاندنی اور اندھیری سر پر ہوتی ہے تارے چمکتے اور دمکتے آنکھ کے سامنے اور بچھڑی ہوئی صورتیں پیش نظر ہوتی ہیں، بہت سے وہ جنہوں نے ابھی دنیا کا کچھ نہ دیکھا تھا جدائی کا بادل امنڈ گھمنڈ کر آیا تھا، کہ موت کے ظالم ہاتھ نے آناً فاناً خاک میں ملا دیا اب ان کی یادگار ایک کمسن بیوہ اور دو معصوم بچے رہ گئے، بہت سی بھولی بھالی لڑکیاں جو بہار دنیا میں برائے نام داخل ہوئی تھیں۔ خزاں کے پنجے سے ہمیشہ کو اجڑ گئیں۔ چند اٹھتی ہوئی کونپلیں ایسی مرجھائیں کہ ان کی پتیوں تک کا نشان باقی نہ رہا۔

ایک رات جبکہ نیند کا غلبہ زور شور سے ہو رہا تھا۔ دنیائے بے ثبات کے کاروبار سے فراغت پا کر لیٹا تھا کہ بچھڑے ہوؤں کی یاد، خیالات کی رو، کہیں سے کہیں بہالے گئی، دل ان پیاروں کی یاد میں تڑپا، آنکھیں ان پر خون روئیں۔ چادر مہتاب چاروں طرف بچھی ہوئی تھی، اور ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے رات چاندنی تھی۔ اور آسمان پرلطف، مگر بچھڑی ہوئی صحبتیں اور چھوٹے ہوئے دوست جو طائران خوش الحان کی طرح اپنی اپنی راگنیاں سنا کر پھر پھر اڑ گئے کلیجے برمارہے تھے اور دل ان کو یاد کرتا ہوا اس طرح نوحہ خوانی کر رہا تھا،

"سدھارنے والو! بھری محفل تمہارے بغیر اجاڑ اور بسی بسائی بستی

کلیجہ منہ کو آتا ہے ہمیشہ کو جدا کر دے،

رات چاندنی اور اندھیری سر پر ہوتی ہے تارے چمکتے اور دمکتے آنکھ کے سامنے اور بچھڑی ہوئی صورتیں پیش نظر ہوتی ہیں، بہت سے وہ جنہوں نے ابھی دنیا کا کچھ نہ دیکھا تھا جدائی کا بادل امنڈ گھمنڈ کر آیا تھا، کہ موت کے ظالم ہاتھ نے آناً فاناً خاک میں ملا دیا اب ان کی یادگار ایک کمسن بیوہ اور دو معصوم بچے رہ گئے، بہت سی بھولی بھالی لڑکیاں جو بہار دنیا میں برائے نام داخل ہوئی تھیں۔ خزاں کے پنجے سے ہمیشہ کو اجڑ گئیں۔ چند اٹھتی ہوئی کونپلیں ایسی مرجھائیں کہ ان کی پتیوں تک کا نشان باقی نہ رہا۔

ایک رات جبکہ نیند کا غلبہ زور شور سے ہو رہا تھا۔ دنیائے بے ثبات کے کاروبار سے فراغت پاکر لیٹا تھا کہ بچھڑے ہوؤں کی یاد، خیالات کی رو، کہیں سے کہیں بہالے گئی، دل ان پیاروں کی یاد میں تڑپا، آنکھیں ان پر خون روئیں۔ چادر مہتاب چاروں طرف بچھی ہوئی تھی، اور ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے رات چاندنی تھی۔ اور آسمان پُرلطف، مگر بچھڑی ہوئی صحبتیں اور چھوٹے ہوئے دوست جو طائران خوش الحان کی طرح اپنی اپنی راگنیاں سنا کر پھر پھر اڑ گئے کلیجے برابر رہے تھے اور دل ان کو یاد کرتا ہوا اس طرح نوحہ خوانی کر رہا تھا،

"اے جانے والو! بھری محفل تمہارے بغیر اجاڑ اور بسی بسائی بستی

سرور پیدا کیا ——— ان کی محبت ایک مصیبت تھی، میرا دل تڑپ رہا تھا ——— قربان ہونے کو، فدا ہو جانے کو، اس قبر پر ——— اس مٹی کے ڈھیر پر ——— جہاں، میرا محبوب، میرا سلیم ——— ابدی نیند سو رہا تھا۔

مَیں اس کے پاس بیٹھی ——— نکاح کی مسند پر، اس کے ساتھ کھیلی ——— کنار دریا پر ——— اس کے ساتھ جھولی ——— پھولوں کے تختہ میں، مگر آج جب، وہ میری، آنکھوں سے چھپ گیا، خاک ہوگیا، اور اس مٹی میں دفن ہے، دنیا، اتنی، اجازت نہیں دیتی کہ چند قطرے اس کی قبر پر چڑھاؤں، اور اس خاک کو بوسہ دوں، اور اس ڈھیر میں سما جاؤں،

"بس چلو"

مَیں نے باپ کا یہ حکم اس وقت سُنا، جب عالم تخیل میں پیارا سلیم گلاب کا پھول ہاتھ میں لیئے میرے سامنے آیا وہ کیا کہتا، سُننے کی منتظر تھی، کہ یہ سُنا، "بس چلو" میں نے چنبیلی کے پھولوں سے، جو چھپا کر لائی تھی، اپنے آنسو پونچھے اور یہ دونو پھول اس ڈھیر پر رکھدیئے، ہوا میرے سامنے چلی، اور ایک سنگدل جھونکے نے دونوں میری آنکھوں کے سامنے منتشر کردیئے۔

دسمبر ۲۳ء

شوہر کی قبر

درختوں کی موسیقی فضائے آسمانی میں گونج رہی تھی اور ہوا کا نغمہ ہر سمت بلند ہو رہا تھا —— تاریکیٔ شب نے پرندوں کو خاموش کر دیا تھا اور نربدا کے کنارے سکون مطلق کو آغوش میں لئے خاموشی کے ساتھ جھوم رہے تھے — ہوا لہروں کو گدگدا رہی تھی لیکن رات کے سناٹے میں جنبش نہ ہوتی تھی۔

آبشار کی سُریلی صداؤں نے نربدا کی خموشی توڑی اور چاند کی ہلکی شعاعوں نے رات کی سیاہ چادر چاک کردی سُنسان لہروں میں غلغلہ پیدا ہوا اور کشتی کی روشنی سطحِ آب پر بہتی ہوئی دکھائی دی۔

وہ چھوٹی سی کشتی کو اکیلی کھے رہی تھی —— اس کا دِل ایک خزانہ تھا، محبت کی لازوال دولت سے معمور —— وہ حسن کی دیوی، وفا کا مجسمہ تھا —— رات کے آخری حصہ نے

کائنات کو محوِ خواب بنا کر اس حسینہ کو کشتی میں ڈال دیا

تھا +

کشتی کنارے پر تھم گئی، زمین نے اس کے قدم چومے،

وہ آگے بڑھی اور اس قبر کو ــــ جس کا مکین نربدا کی

خطرناک لہروں کا شکار ہوا تھا ــــ بوسہ دیا، اور چراغ جلا کر

خاموش بیٹھ گئی +



کشتی نربدا کے پانی میں اور اس کے پاکیزہ جذبات فضائے

قلب میں تیر رہے تھے ــــ تاروں کی چھاؤں اس کے سر پر

تھی، اور چاند، اس کی گود میں اٹھکیلیاں کرتا ہوا، خاموش

ہو رہا تھا۔

یہ اس کے شوہر کی قبر تھی

۲۶

میری آرزو

جمنا کے اس کنارے پر، جہاں دو فانی جسموں کی ہڈیاں، ہڈیوں کی خاک، خاک کے تودے، اینٹ پتھروں سے مزین، گل بوٹوں سے آراستہ، فلسفہ محبت کو حل کر رہے ہیں، جہاں ہوا تعلقات قلبی کا درس دے رہی ہے، جہاں، قمری، خلوص کی صدا دیتی ہے۔ جہاں پتے سچی محبت کی آوازیں لگاتے ہیں، اندھیری رات میں پانی کی آواز سنتی ہوں، ہوا کی تیزی دیکھتی ہوں، پرندوں کی صدا کان میں آتی ہے۔ پھولوں کی خوشبو دماغ میں پہنچتی ہے، دیکھتی ہوں اور کچھ نہیں سمجھتی ہوں اور خاک،

لہریں آتی ہیں، ٹکراتی ہیں اور چلاتی جاتی ہیں ——— پھول کھلتے ہیں، اتراتے، مرجھاتے ہیں ——— تارے چمکتے ہیں، دمکتے ہیں، اور جھلملا جاتے ہیں ——— دیکھتی ہوں اور روتی ہوں ——— سنتی ہوں اور رہ جیتی ہوں۔

شاہجہاں بیگم، خوش نصیب تھی، اس کی موت زندگی سے اچھی، پھول اس کے پاؤں میں لوٹ رہے ہیں، جمنا اسے گود میں

لئے کھڑی ہے، اکبر آباد اس پر ناز کر رہا ہے مگر...... آہ ...... میں برہ کی ستائی ہوں، دکھیاری ہوں، ڈھونڈ پھری، گوکل ہردوار، جمنا، گنگا .... مگر..... ...مگر......

شہنشاہ خلوص کا پتلا تھا، محبت کے پھول اس کے سرہانے مہک رہے ہیں، کیا اچھا وقت اور بہار کا موسم ہے، بیگم، سدا بہار پھولوں کا گجرا، اپنے ساجن کے گلے میں ڈالتی ہے۔

ہوا نے دعائیں دیں، آناً فاناً یہ خوشبو، دنیا بھر میں مہک گئی، اچھا، بیگم، خوشا نصیب۔

آہ! میں، سدا کی روگی، ہمیشہ کی بدنصیب ——— دل کا کنول، یہاں بھی نہ کھلا یہ سہانا مجھکو مصیبت ——— یہ ہوا مجھکو آفت، یہ سماں یہ عمارت، یہ لوگ، یہ حالت ——— میرے کلیجہ پر نشتر ہیں۔

بس کیا دیکھوں، کیا سنوں، کچھ نہیں، میں وہاں جاؤں جہاں پدمنی جلتی ہو ——— بیشک بیشک، پدمنی ہو، حسن کی دیوی وفا کی چہیتی، اس کی چتا ہو، اس راکھ کو آنکھوں سے ملوں وہاں تڑپوں اور اس میں مل جاؤں،

جذبۂ نسوانیت

ایک سنسان ساعت میں ——— جب چاند غور سے کائنات کے مطالعہ میں مصروف تھا ——— پانی کے پیٹ میں ہوا کی گدگدیوں سے ہنسی کے مارے بل پڑ رہے تھے اور ان قہقہوں پر جو لہروں کی صورت میں فنا ہو رہے تھے ——— مسکرانے والا دریا کا صرف ایک درخت تھا،

رات بھیگ رہی تھی اور چاند کا روشن چہرہ شباب کی منزلِ مقصود تک پہونچ چکا تھا، مگر ہوا کی شوخیاں لمحہ بہ لمحہ ترقی کر رہی تھیں، پانی کی کمر اس کے ہچکولوں سے لچک رہی تھی، باغ لہک رہا تھا، تارے چمک رہے تھے ——— کہ آبشار نے وجد میں آکر اپنا نغمہ شروع کیا، موسیقی کی مجسم تصویر چاروں طرف پھیل گئی اور آسمانی مخلوق نے اپنی خاموش نگاہیں اس مہ جبین پر ڈالیں۔

اس تماشہ کی دیکھنے والی صرف صنوبر کی سبز پتیاں تھیں۔

بزمِ قدرت کے چمکدار مہمان، اپنے دیوتا پر قربانیاں چڑھا رہے تھے ———

یہاں تک کہ ہوا کا ایک متوالا جھونکا، محبت میں شرابور چلا اور دو قدم چل کر، سر ٹکراتا ہوا فنا ہو گیا، محبوبہ قدرت کی شمع نظر اب بھی ارضی تماشہ پر جمی رہی اور اس نے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا کہ مسرور ان بزم کس طرح اپنی ہستیاں فنا کر رہے ہیں، سب سے پہلے چمکدار جگنو، اس شمع خاموش پر پروانہ وار قربان ہوئے، کائنات بھی اس فرض سے بیخبر تھی، مگر آغوشِ صنوبر کا ایک آشیانہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا،



نشیمن صنوبر کی بسنے والی روح یا مٹھی بھر پروں کا ذخیرہ دو صورتوں میں منقسم تھا، اسے تعبیر ہونے والی ایک ہستی تو ربھر گرشت کر، پروں میں چھپائے بیٹھی تھی، اس کا کاسہ حیات جذبات سے محروم نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ احساسِ انسانی کی تمام شعاعیں اسی مخزن سے طلوع ہو رہی ہیں، فطرت نے پیامِ اجل نغمۂ دلکش کی صورت میں، طوق گردن کیا، اور غروب آفتاب کے ساتھ بسیرے کے وقت جب دوسرے ہمجنس، مصروف بکا تھے، رفیق حیات کو، جدا کر دیا،

اندھیرے کی وسعت، ہر لمحہ کے بعد پردۂ دُنیا کے جذب کرنے میں ترقی پذیر تھی، مگر ایک خوشنما گردن کی دو بہت چھوٹی آنکھیں آواز پر کان لگائے بیٹھی تھیں احساس انسانی سے بہت دور، لباس انسانی سے متجاوز، اسکا انداز صنوبر کے پتے اور آشیانہ کے تنکے ادا کر رہے تھے،

وادیٔ سیراب کے، قصر بنگلوں سے، ایک دوسرا چاند چمکا، یہ

مملکتِ حسن کی خاموش ملکہ تھی اور کائنات فلکی کی طرح، ساکت، صرف ایک خیال میں محو تھی، اس کی منتظر آنکھیں۔ محبت کے شاداب پودے کی نشو و نما میں مصروف تھیں، اور ایک سرد آہ جس کے ذرات فضا خلوص میں منتشر ہو رہے تھے، کبھی کبھی نظر آجاتی تھی اس کی سرگیں آنکھوں کے ڈبڈباتے ہوئے آنسو، ایک دل خوش کن وعدے پر معصومیت کی نذر چڑھا رہے تھے وہ دنیا کی ہر حرکت اور انسانی دنیا کے ہر فعل سے بیخبر تھی، اس کے سامنے صرف ایک چیز تھی، اور یہ وہ تھی جس کو، قانونِ حیات، شوہر بنا رہا تھا،



مگر حسینہ کی توقعات، شوہریت کے دائرہ میں محدود نہ تھیں ——— وہ دلدادہ تھی خلوص کی ——— وہ متمکن تھی، آبادی محبت میں ——— اور متوقع تھی انسانیت کی ——— وہ منتظر تھی، ایفاء عہد کی ——— وہ عہد جس میں محبت جذب ہو کر فنا ہو جائے ——— وہ عہد جس کا ہر ذرہ محبت سے پیوستہ ہو +

اسکو یقین تھا کہ آج آفتاب، اس وقت تک، نہیں ڈوب سکتا ——— جب تک میری، آنکھیں، جمالِ شوہری سے اسیر اثر ہو جائیں ——— مگر آفتاب ا روپوش ہو گیا، اور اب جبکہ ——— کائنات ارات کی رفتار سے بیخبر تھی ——— اسکی آنکھیں اس مقام کا ——— جہاں سے اس کی توقعات بیدار ہوئیں، کبھی کبھی ایک گہری نظر سے مطالعہ کرتی تھیں ——— اس کی آمد کا ——— جو غافل تھا اس انتظار کی ماہیت سے ——— مگر اس انتظار میں کیا تھا ——— وہ پاک جذبہ ——— جو نسوانیت کا جوہر اعلیٰ ہے +

بانسری کا نغمہ

جب بانسری کا نغمہ ہوا میں فنا ہو رہا تھا تو سر سرانے والے پتوں نے دیکھا کہ کالی ناگن پان کی بیل سے لہراتی ہوئی نکلی ــــــــ

پرستار موسیقی سیاہ ناگن نغمہ پر وجد کر رہی تھی، چاروں طرف دیکھتی تھی مگر اس کی نگاہ منزلِ مقصود سے بہت دور تھی ــــــــ

گڈریے کی بانسری کا نغمہ ہَوا میں تیر رہا تھا۔ اس نے کائنات کا تبصرہ کیا اور ہَوا کی گود میں دم توڑ دیا ــــــــ

ناگن آگے بڑھی مگر اب جنگل خاموش تھا اس کی آنکھیں اپنے محبوب کو چاروں طرف ڈھونڈھ رہی تھیں۔ مگر سنگدل گڈریا اس سے بے خبر ہو کر کہ اس نے ناگن کے سمندر حیات میں کیا تلاطم پیدا کر دیا ایک ٹوٹی سی قبر پر بیٹھا اپنے مویشیوں کا انتظار کر رہا تھا ؎

سنہ ۲۴ء

کل کیا ہوگا

ایک بے ہوش ندی کے کنارے ——— جس کا شفاف پانی مچل مچل کر اپنی منزل طے کر رہا تھا ——— ایک سرسبز درخت کے نیچے ——— جس کی ہری بھری پتیاں جھوم جھوم کر قہقہے لگا رہی تھیں ——— دامنِ کوہ کی ایک چٹان پر ——— جس کے سنگریزے چمک چمک کر قدرت کی نیرنگیاں دکھا رہے تھے ——— شب سیاہ نے اپنی داستانِ مصیبت شروع کی ——— چاند سے بچھڑی ہوئی فریادوں کی صدا پردۂ دُنیا پر گونجی ——— مگر آہ وہی چمکدار خوشنما تارے ——— جو کل تک سامانِ زینت تھے ——— اس وقت ٹھٹھے لگاتے ہوئے آگے بڑھ گئے ——— اور مجھ بدنصیب کی طرح جو اپنے محبوب کی تلاش میں جنگل کی خاک چھان رہی تھی رات نے بھی سر ٹیک ٹیک کر اپنی منزل کا بڑا حصہ طے کیا۔

صبح قریب آ رہی تھی اور میرا زخمی دل اس پانی کی طرح جو آنکھ کے سامنے اچھل رہا تھا تڑپ تڑپ کر مجھکو دیوانہ کرنے لگا اب ایک درد بھری صدا نکلی ——— مگر

ابھی زبان پر نہ آئی تھی کہ ہوا نے اپنی ہتیلی منہ پر رکھی اور یہ جگر خراش نالہ ٹھنڈا سانس بنکر واپس ہوگیا۔

آج اِنسانی دُنیا اس درد کے اندازہ سے غافل ہے، مگر آسمانی کائنات میری حالت پر رو رہی تھی —— شبنم کے قطرے میرے **قلب حزین** پر ٹپک رہے تھے۔

زندگی کا ہر لمحہ فنا ہو رہا تھا اور مَیں ایک قابلِ رحم نسوانی ہستی اس جرم کی متلاشی تھی، جس نے طلاق کا طوق گلے میں ڈلوا کر زندگی برباد کر دی —— وہ کیا تھا؟ کچھ نہ تھا۔ مگر ہاں تھا۔

وہ، وہ تھا جس کی ذمہ دار میں نہ تھی —— میری ایک ہمجنس کا اصرار کہ "مجھکو طلاق ملے"

وہ اصرار پُورا ہوا۔ اب دونو میاں بیوی خوش ہیں اور مَیں اُس کے ظلم کا شکار ہوں —— ؟ شوہر کے، جس نے مجھکو چھوڑ دیا —— نہیں

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من آنچہ کرد آں آشنا کرد

میں اپنے ہی ایک بہن کے اصرار پر جو آج پھولوں کی سیجوں پر بے خبر پڑی سوتی ہے، اس جنگل میں رو رہی ہوں، مگر کون کہہ سکتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔

اپریل ۳۱ء

بیوہ جوگن

میں پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی، اُن آنکھوں سے، جو تھوڑی دیر پہلے غروبِ آفتاب کے حسرت انگیز منظر کو غور سے دیکھ رہی تھیں، بزمِ فلک کے سرتاج، ماہتاب، کی شاہانہ سواری کے مطالعہ میں منہمک تھی، چمکدار تارے پروانوں کی طرح، قندیلِ آسمان پر قربان ہو رہے تھے، ناکام پرواز چکور، تھک تھک کر مایوس ہو رہی تھی۔
میں نے دامنِ کوہ میں ایک چراغ ٹمٹماتا دیکھا، ان قدموں سے جو شوق سے لبریز تھے، میں چٹانوں کو روندتی آگے بڑھی، سرسبز درخت جو ہوا میں جھوم رہے تھے، جن کی خوشبو فضائے آسمانی کو معطر کر رہی تھی مجھے سہارا دیتے رہے، پتیوں نے قہقہے لگا کر شاخوں نے ہاتھوں میں ہاتھ لے کر مجھے منزلِ مقصود تک پہنچا دیا۔

یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ جو بھولے بھٹکے مسافروں کا خضرِ راہ تھا، اس وقت جب آفتاب دم توڑ رہا تھا ایک

جوگن کے ہاتھوں نے روشن کیا، چشمہ قریب تھا اور جوگن مٹی اور راکھ کی بھبوت ملے کائنات شب کو غور سے دیکھ رہی تھی، سایہ ماہتاب نے جوگن سے تعارف کیا۔ لٹیں خاک میں اٹی ہوئی تھیں۔ مرگ چھالا بچھا ہوا تھا۔ اور یہ انسانی ہستی کسی دھن میں مستغرق کچھ جپ رہی تھی —— جس طرح ایک مضراب دریائے موسیقی میں ستار کے پردوں کو تڑپاتی ہوئی تلاطم پیدا کر دیتی ہے —— یا ایک کوئل اپنے سریلے نغموں سے کرۂ ہوائی میں پہاڑ کے ٹکڑے اڑاتی ہوئی قیامت برپا کر دیتی ہے —— اسی طرح یہ ہڈیوں کا مجسمہ تخیل انسانی کے پرزے اڑاتا ہوا —— بجلی کی طرح —— میرے دل پر گرا، میں قریب پہنچی، جوگن نے ٹھنڈا سانس بھرا، سانس کے ساتھ درد و الام کے پوشیدہ ذرات تھے، جو ناکامی میں ڈوبے ہوئے زندگی کی تمام توقعات پر پانی پھیر رہے تھے،

اس حیرانی اور تعجب سے جس کی کوئی انتہا نہ تھی، میں خاموش آگے بڑھی، تو جوگن نے کہا

"کیوں بچہ اس جنگل میں تمھارا کیا کام؟"

میں قدموں پر گری اور عرض کیا "مطالعہ کائنات میں مصروف ہوں پہاڑ کی چوٹی پر ڈیرہ ہے، پھرتی پھراتی

ادھر آ نکلی، کچھ اپنی کتھا سُنایئے،

جوگن نے ایک قہقہہ لگایا مگر وہ قہقہہ جس میں آنسو گرے۔ اور کہا "دو سال ہوئے پتیم چھوٹ گیا، اب دنیا کی ہر چیز زہر لگتی ہے، میں ہوں، میری بکری ہے۔ میری جھونپڑی ہے دُنیا کا ہر لطف یہاں موجود ہے، ہاں تعلقات کی مصیبت جو آبادی تھی اس سے محفوظ ہوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ یہاں آبادی کے کسی لطف سے محروم ہوں، یہاں ہر شئے موجود ہے ـــــ بادل جھُوم جھُوم کر قدرت کے تماشے ہر وقت دکھاتے ہیں، چشمے مچل مچل کر، ہوا اٹھلا اٹھلا کر اور پتے جھُول جھُول کر قدرت کی نیرنگیاں دکھلاتے ہیں۔"

میری حیرت ختم ہوگئی، میرا تعجب جاتا رہا، اور میں نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے مگر منزل مقصود پر پہنچنا پتیم کا مل جانا ہے اور منزل مقصود پر پہنچنا یہاں ممکن نہیں۔ یہ آبادی میں ہے ـــــ جہاں خدا کی لاتعداد مخلوق انسانی صورتوں میں موجود ہے، پتیم ان ہی کے دِل میں ہے اور منزل مقصود وہیں ہے۔"

جوگن نے غور کیا اور ہنستی ہوئی اُٹھی میرے ہاتھ کو بوسہ دیا اور کہنے لگی "پتیم کی یاد یہاں خوب ہوتی ہے، جس کی تلاش میں وہاں عمریں ختم ہو جاتی ہیں، وہ یہاں ہر وقت آنکھ کے

سامنے ہے"

میں نے جوگن کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر کہا" یہ آنکھ کا دھوکا اور دل کا فریب ہے۔ یہاں کہیں نہیں ہے اور کچھ نہیں ہے، وہاں ہر مخلوق کی رضا مندی رضا مندی خالق ہے، پیتم وہاں ہے، ہر شخص میں ہے اور ہر دل میں ہے، چل اور ڈھونڈ، تلاش کر اور پا"

ایک معمولی سکوت نے جوگن کے ہونٹ خاموش کر دیئے اس نے میرے قدم لیئے اور کہنے لگی، "ہاں! سچ ہے!!"

دِل بدست آور کہ حج اکبر است

اپریل ۲۳ء

یاسمین کا پردہ

چاندنی رات میں، جب پائیں باغ کی مخلوق سو چکی تھی، میں بے خبر پھولوں کے سرہانے پہونچی، بلبل کا نغمہ بند ہو چکا تھا، اور ہوا کی موسیقی خاموش تھی، سنسان روشیں، سبزہ کی چادر اوڑھ کر ساکت ہو گئی تھیں، باغ کا ہر پھول، اور گھانس کی ہر پتی محوِ خواب تھی،

چاند، منزل سحر میں، گامزن تھا، اور رات، آفتاب کی طرف
بھاگ رہی تھی، ندی کا راگ ختم ہو چکا تھا، اور آبشار کی صدائیں
بند تھیں، میں نے اپنی خاموش، نظروں سے، پھولوں
کی نیند، اور باغ کا سکوت دیکھا، سناٹا ہولناک تھا
اور منظر دِل فریب،



ہَوا میرے سامنے سرسرائی، تناور درختوں کے پتے میں نے
جھومتے ہوئے دیکھے، ندی کے قہقہے میرے کانوں میں
آئے، بُلبُل کا پیام صبح باغ میں گونجا، پھولوں نے
کروٹ لی، اور سبزہ انگڑائیاں لینے لگا،
نسیم کی اُنگلیاں چنبیلی کی کمر میں گھُسیں، گلاب ہنستا
ہوا آگے بڑھا، اور باغ کی خموشی میں چہل پہل ہو گئی؛
ہَوا کا نغمہ تیز ہوا۔ اس کی شرارت نے ترقی
گلاب کِھل کھلا کر ہنسا، چنبیلی نے اپنا نازک چہرہ سبز
پتیوں میں چھپا لیا، مَیں بے ساختہ چیخ اُٹھی،
"یاسمین گلاب سے پردہ کرتی ہے"
فروری ۲۸ء

مایوس

اِن خاموش پہاڑوں کی طرح — جن کی طاقت، زمین کی حِدت فنا کرچکی ہو — اس کی سرمگیں آنکھوں سے، آنسوؤں کی تسلسل ندیاں رواں تھیں،

موسیقی کا مجسمہ کا دل اس کے سینہ میں تیر رہا تھا اور زندگی کی مغنیہ اپنی سنگین مضراب سے، جذبات قلب کو چھیڑ رہی تھی،

موسم گرما کی ٹھنڈی ہواؤں نے اس کی زلف سیاہ کو اپنے آغوش میں لیا اور شب ماہ اِس کے حُسنِ خدا داد پر قربان ہونے لگی —— اس کی ہستی آرزوؤں کا گہوارہ تھی،

ناکامیوں کے اثرات اس کے گردوپیش فضا مایوسی میں جھوم رہے تھے، حسرتوں کا تلاطم بپا تھا — دُھواں دھار گھٹائیں اِس کے دِل پر برس رہی تھیں اور قدرت کا ہر لطف اِس کے واسطے درس ناکامی تھا —— درخت کی پتیاں اس کی بدقسمتی پر نوحہ خواں تھیں ——

ہوا کا لامتناہی سلسلہ نغمہ طیور سے معطر ہوکر اس کے زخموں پر نمک پاشی کر رہا تھا —— وہ تنہا تھی لیکن ہجوم افکار اس کے مونس تھے، اور جذبات کا طومار اس کے رفیق،

اس نے نظر بند کی، آسمان کا نیلا سمندر سامنے تھا، تخیل نے متواتر غوطے کھائے، اس نے ہر سمت دیکھا، کھڑی ہوئی اور ٹہلنے لگی —— کون کہہ سکتا تھا کہ —— اس کی مظلوم نسوانیت، انسانی سرد مہری کی شکر گذار ہے +

فلسفۂ موت

وہ ایک عجیب لمحہ تھا جب کائنات کی ہر شے قطعاً خاموش تھی۔ کفن کے خوبصورت پھول جو زندگی کے فانی تعلقات کو ختم کر چکے تھے، اپنی خوشبو سے فضاء آسمانی کو معطر کرنے لگے۔ عزیزوں کا نالہ سکون سے بدلا، شیدائیوں کا شیون خاموش ہوا اور فنا کا مجسمہ ہر آنکھ کے سامنے آ گیا،

اس خاموش لمحہ میں، ہوا کی موسیقی بند ہو گئی پتوں کی رفتار رکی اور پرندوں کا نغمہ تھا — ایک منفقہ آواز گونجی، آنسوؤں کے چند قطرے بعض رخساروں نے اپنی گود لئے نیلگوں آسمان نے آفتاب کا جنازہ شفق کی آغوش میں رکھا اور موت کی خطرناک تصویر ہر سمت نظر آنے لگی،

خاموش لمحہ میں جو سناٹا چھایا ہوا تھا، چرواہے کی بانسری نے اس کو توڑا، شام کی سیاہی قبرستان کے رہنے والوں کو لوریاں دینے لگی، ماتمی باجہ شروع ہو گیا، اور ایک عزیز کی آخری خدمت کے واسطے بہت سے ہاتھ آگے بڑھے، خدائی الفاظ جنگل نے اپنے آغوش میں لئے!!

اب وہ وقت آیا کہ وہ شخص جو آجتک زندہ تھا، اس کے واسطے زندگی کا ہر قانون بے کار ہو جائے۔

کچھ الفاظ کے ساتھ، جو باواز بلند پڑھے گئے، ایک جسم قبر میں اتار دیا گیا۔ خاموشی کا لمحہ ابھی چھایا ہوا تھا ——— کہ رونے والوں کے قہقہے نے فلسفۂ موت کو حل کر دیا۔

بعد الموت

اگست کے چنچل آسمان نے مئی جون کے مضطرب بخارات کو جو جلتی بھُلستی زمین سے بر آمد ہو کر کرۂ ہوائی میں جذب ہو رہے تھے فنا کر دیا۔ دُنیا کے ہر لمحہ کو سکون و اطمینان سے گذارنے والا کائنات کا ذہن، بادی النظر میں ان کی یاد سے خالی ہے لیکن اس کا سینہ دفتر سے گوناگون تاریخ کے اوراق پارینہ کا زندگی موت سے خالی نہیں ہے اور قدرت نظام عالم کے قایم کرنے میں فانی اجسام کے اثرات سے پوُری مدد لے رہی ہے۔

قلب اِنسانی ابھی لُو کے تھپیڑوں اور زمین کے بخاروں کو بھولا نہ تھا کہ ساون بھادوں کی اندھیری راتیں اگست ستمبر کے بیقرار دِن تبدیل ہیئت کر کے سروں پر نمودار ہوئے ان کی آنکھیں مردہ ابخرات کی یاد میں آنسو گرا رہی ہیں اور وہ متادی وجود جو کل آنکھوں کو بار گراں تھے۔ آج فرصت انبساط کے ڈیرے ڈال رہے ہیں، میں اپنی کائنات کو وداع کر کے دوسرے کاموں میں مصروف ہوگئی قدرت ارضی مہمانوں کو موت کے گھاٹ اُتار کر زندوں کی نشو و نما میں منہمک ہے لیکن مردہ اشیا کے وجود

بقاء حیات میں خاموشی کے ساتھ نظام کا ہاتھ بٹا رہے ہیں،
ستمبر کی موسلا دھار بارش نے بیمار درختوں میں نئی روح پھونک دی کھڑنک شاخیں، سبز اور لاجونتی زیور سے لدگئیں، خاموش پودے پھولوں سے مہکنے لگے ہوا نے ہر چہار سمت خوشبو کے نقارے بجائے۔ تا آنکہ بلبل نے باغ اور بادِ سحری نے مرغزار سر پر اٹھالیا، جنگل ہرے بھرے درختوں سے پٹ گیا اور چمن آتشِ گل سے دہکنے لگا۔ مگر وسط مارچ کی ہوا نے جو خزاں کے پہاڑوں سے بلند ہوئی عروس بہار کو رنڈسالہ پہنایا، لدے پھندے درخت ٹھنڈ ہوگئے اور خوش رنگ پھولوں کی پتیاں کیاریوں کی آغوش میں مرجھا مرجھا کر خاک ہوئیں۔

آج اُجڑے ہوئے چمن میں بہار کی یادگار ایک پھول ہوا کی گود میں جھول رہا ہے درختوں کی طراوٹ رخصت ہوئی پیپل کے درخت میں دو خاموش پتے ہوا کے جھونکوں کا انتظار کر رہے ہیں پُرلطف سماں نذر خزاں ہوا، لاتعداد پتے پک پک کر اور بیشمار پھول کھل کھل کر فنا ہو گئے دُنیا کی چشمِ ظاہری ان کو فراموش کر چکی۔ مگر قدرت مردہ آغوش میں زندوں کی پرورش کر رہی ہے اور یہ فانی اجسام نظام عالم کے برقرار رکھنے میں مددگار ہیں۔ پھول مرجھا چکے مگر ان کی

یادگار ان کے بیج موجود ہیں۔ درخت لٹ چکے لیکن ان کے پیوند دُور دراز مقامات پر تروتازہ ہیں اور یہ آخری پتہ جس کو ہوا نے اُڑا اُڑا کر زمین پر پہنچا دیا کوڑا اور کھاد بنکر اپنے جیسے سینکڑوں پتے پیدا کرے گا۔

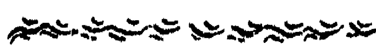


اکتوبر اور نومبر کے مہینہ میں جب سردی شروع ہوتی ہے۔ لُو کے تھپیڑے ختم اور گرمی کی شدت رخصت ہوجاتی ہے تو آسمان پر ان پرندوں کی قطاریں نمودار ہوتی ہے جو موسم گرما بسر کرنے کو پہاڑوں پر چلے گئے تھے، ان کا قافلہ سالار یا رہنما نہیں ہوتا ان کا رُخ اسی تالاب جھیل یا دریا کی طرف ہوتا ہے جہاں سے گئے تھے نومبر کی طویل راتیں کسی نا معلوم پانی میں بسر کرتے ہیں اور اجنبی کھیتوں کی پیداوار سے پیٹ بھرتے منزل مقصود پر پہونچتے ہیں۔ آخر نومبر میں ان کے پرے کے پرے اپنے اپنے کناروں پر پہونچ جاتے ہیں آس پاس کے کھیت ان کی مہمان نوازی میں مصروف ہوتے ہیں اور خوشگوار موسم ان کو دنیا ومافیہا سے بیخبر کر دیتا ہے۔

دسمبر کی کسی صبح کو جب ایک بندوق کی آواز کے ساتھ ایک بشاش شکاری کنار دریا پر ہاتھ میں قاز لئے نظر آتا ہے، تو کنارے سے کچھ دور آگے مٹی کے ٹیلہ پر جس کے چاروں طرف

پانی ہوتا ہے ایک نر یا مادہ کی گردن بھی دکھائی دیتی ہے جس کی حفاظت میں دو تین انڈے ہوتے ہیں۔

قاز کی زندگی پوری ہو گئی مگر قدرت نے اپنا کام اس سے لے لیا۔



سال بھر کی دولہن ختم ہوئی عزیز و اقارب رو رہے ہیں مگر زندگی کی دایہ اس بچہ کو آغوش میں لئے ہنس رہی ہے اور رونے والوں سے پوچھتی ہے کہ یہ تین مہینے کی جان دنیا کی مسرتوں میں کس قدر اضافہ کرے گا اور آرام میں کتنی ترقی۔؟

کبھی غور کر اس پر بھی اے انسان! کہ تیری موت زندگی کے واسطے کچھ چھوڑے گی!

اور وہ کیا ہوگا؟

جنوری ۲۷ء

مشرقی بیوی

پرستارانِ مغرب! سات سمندر پار کے بیل بوٹے دیکھ چکے، پردیسی پھولوں کی بہار خوب لوٹی، غیر زمین کے پرندوں کا نغمہ سُن لیا، اب اِدھر رُخ کرو یہاں کیچڑ میں موتی اور گدڑی میں لال ملیں گے، متجسس نگاہ کی ضرورت اور تلاش کی دیر ہے، انصاف کی کسوٹی پر پرکھنا، حقیقت کے کانٹے میں تولوگے تو یہ جواہرات باون تولے پاؤ رتی کے نکلیں گے،

مغربی نغمہ کی گونج ابھی تمہارے کان میں موجود ہوگی کہ

"مرگیا سو گیا"

مشرقی بیوی کا کہرام دیکھو، شوہر کی موت اس سے کیا کیا لے گئی، نازک ہاتھ سونڈا سے رہ گئے، ان کی چوڑیاں کہاں گئیں؟ رنگین کپڑا ختم ہوا، سرمہ کاجل کدھر گیا، "یہ سب صرف ایک دم سے تھا"

اِس کی مُسکراہٹ پر نہ جاؤ ـــــ اِس کا دِل رو رہا ہے ـــــ اِس کو خاموش نہ سمجھو، اس کے کلیجہ میں آگ لگ رہی ہے ـــــ یہ عورت نہیں ہے، اس کی نسوانیت ختم ہوگئی! ـــــ یہ بیوی نہیں ہے، اس کی قسمت بگڑ گئی ـــــ یہ جب دُلہن تھی، سہاگن تھی، سب کچھ تھی ـــــ آج رانڈ ہے بیوہ ہے، کچھ نہیں ہے،

یہ مُفلس نہیں ہے ـــــ دولت اس کے پاس، عزیز اس کے ساتھ، بیٹے بھی ہیں اور بیٹیاں بھی ہیں، یہ دُنیا کی بہت سی نعمتوں کی مالک اور بڑے گھر پر حکومت کر رہی ہے، مگر چمنستان زندگی کا وہ پھُول جو اس کا دِل اور دماغ معطر کرتا تھا مُرجھا گیا، اور وہ آنکھیں جو جمال محبُوب سے سیراب، اور وہ دل جو محبت کی دولت سے مالا مال تھا، آج اُن میں آنسوؤں کی قطار اور داغوں کی بہار ہے۔

یہ وہی آنکھیں ہیں ـــــ جن میں کاجل ہوتا تھا ـــــ یہ وہی دِل ہے جس میں محبت رہتی تھی، اس وقت قصر حیات کے دو نو ستون اُجڑ گئے، آنکھیں ناکامی کی تسبیح پڑھتی ہیں اور دِل ہائے ہائے کے نعرے لگاتا ہے۔

زندگی کی بڑی سے بڑی خوشی، دُنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ نعمت، اس کا مرجھایا ہوا کنول اَب نہیں کھلا سکتی، یہ اس خوشی میں بھی جو کبھی اس کا ارمان تھا ہنستی ہوئی شریک ہوتی ہے اس کی زبان اظہار مسرت بھی کرتی ہے، مگر اس کا دِل روتا ہے، اور بچھڑنے والے کی یاد رہ رہ کر اور تھم تھم کر اس کا کلیجہ مَسلتی ہے۔

جب مائیں کھانا پکا چکتی ہیں بچے کھانا کھا چکتے ہیں اور گھر کی دُنیا اپنی ضرورتوں میں مصروف ہو جاتی ہے تو یہ آنسو بھری آنکھوں سے باورچی خانہ میں جاتی ہے، اپنے ہاتھ سے آٹا گوندھتی ہے، روٹی پکاتی ہے اور ایک آدمی کا کھانا تیار کرکے خاموش صحن میں اُٹھتی ہے کہ اس کے کانوں میں یہ آواز گونجتی ہے: "مسجد کے طالب علم کی روٹی دیدیجئے!"
یہ چونک پڑتی ہے آسمان کی طرف دیکھ کر گڑگڑاتی ہے اور کہتی ہے۔

"اِس کا ثواب اُن کی روح کو"

یہ کہہ کر کھانا دیتی ہے اور ادائگی فرض کی ایک خوشی اور خوشی کی ایک جھلک چہرہ پر نمودار ہوتی ہے، یہاں تک کہ آفتاب غروب ہوتا ہے اور رات کا سایہ سر پر چھا جاتا ہے، جس وقت دُنیا نرم گرم بچھونوں پر لیٹتی ہے یہ اپنے عقائد کے موافق کچھ پڑھتی ہے اور شکر بجا لاتی ہے اور اس وقت اس کو وہ خوشی حاصل ہوتی ہے، جو دِن بھر میسر نہیں ہوتی،

سنہ ۲۳